صدرالدین آزردہ ایک نادرِ روزگار شخصیت

عالیہ

لین نمبر 1، نورالٰہی نارتھ، گھونڈہ، دہلی۔110053، موبائل:7503090927

برطانوی سامراج کا ابتدائی دور نہ صرف ہندوستانیوں کے لیے روز محشر کے مماثل تھا بلکہ فرنگیوں کی تہذیب اور ان کی طویل جمہوری روایات پر بھی ایک بدنما داغ تھا۔ اپنی حکومت قائم کرنے کے لیے ایک طرف ہندوستانی سیم وزر پر غاصبانہ قبضہ کرنے کے لیے انھوں نے ظلم وستم کی تمام حدود سے متجاوز کیا دوسری طرف ہندوستانی دانش وروں میں یہ لطائف الحیل اور یہ احساس کمتری بھی پیدا کرنے کی کوشش کی کہ ہم ہندوستانی حکومت کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ فرقہ بندی اور بے ایمانی جیسے جراثیم ہمارے خون میں شامل ہیں۔ فرنگیوں کی کوشش تھی کہ دانش ور طبقے کو ایسی سزائیں دی جائیں کہ ہندوستانی ذہنی طور پر پژمردگی اور کمتری کا شکار ہوجائیں۔

اس زمانے کے اس قدر ابتر حالات تھے کہ جس شخص کو کسی کے ساتھ دشمنی تھی وہ اس کا نام بتا دیتا تھا، ہر طرف جھوٹے گواہ کھڑے ہوگئے۔ ایک طرف باغیوں کا ڈر تھا۔ دوسری طرف رشتہ داروں اور ہمعصروں کے جھوٹے الزامات کا خوف دامن گیر تھا۔ بے گناہ اشخاص سے لاچار بے کس عورتوں اور بچوں کا اس طرح قتلِ عام کیا جارہا تھا کہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آیا تھا۔

اس سلسلے میں اوّلین اردو اخبار کے مدیر ''مولانا باقر'' امام بخش صہبائی ان کی اولاد، داغ کے والد نواب شمس الدین اور مرزا غالب کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف خان کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ جن کو معمولی خطاؤں یا جرمِ بے گناہی پر سزائے موت دی گئی۔

اس سلسلے میں ایک اقتباس نقل کرنا بے محل نہ ہوگا:

محمد علی (نواب جنگ خاں کے صاحبزادے جو دادری کے راجہ کے بھتیجے تھے) نے وسط مکان میں بندوق چلائی اور تین پورپینیوں کو مار گرایا۔ اس پر ایک بڑی فوج مکان پر حملہ آور ہوئی اور تمام اہلِ خانہ کو قتل کر ڈالا۔ محمد علی بھی مقتولوں میں تھے، مگر آخر وقت تک لڑتے رہے تھے۔ تقریباً ۶۰ ہتھیار بند آدمی جن میں شیخ امام بخش صہبائی اور ان کے صاحبزادے بھی شامل تھے جو اسلامی کالج سے متعلق تھے، باغی سمجھ کر قتل کر دیے گئے۔ ان ہی میں فلاح اللہ خاں بھی تھے جو اپنے زمانے کے مشہور طبیب تھے، دیگر لوگ بھی جنھوں نے بغاوت میں کسی قسم کا حصّہ نہیں لیا تھا، قتل کئے گئے..... مرزا اسداللہ خاں کے بھائی مرزا یوسف خاں جو مدت دراز سے حالتِ جنون میں تھے گولیوں کے شور کی آواز سن کر یکایک باہر نکلے مارے گئے..... خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں پر اس طرح سے قہر نازل کیا کہ خشک و تر سب ہی کچھ جل گیا۔ بے گناہوں اور مجروں کو یکساں سزا ملی۔ جس طرح سے ۱۱ رمئی کو بے گناہ عیسائی قتل ہوئے تھے۔ اسی طرح ۲۰ ستمبر ۱۸۵۷ء کو بے گناہ مسلمان قتل ہوئے۔ جو لوگ تلوار سے بچ رہے انہیں پھانسی پر لٹکایا گیا ان میں نواب مظہرالدولہ، محمد حسین خاں، مرزا احمد خاں، میر محمد حسین خاں، اکبر خاں، میر خاں، نوشہر خاں، حکیم عبدالحق، خلیفہ اسماعیل، محمد خاں، رسالدار صدر بیگ خاں، عسجد یار خاں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

(حوالہ: جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء دو خفیہ روزنامچے، مصنف معین الدین حسن خاں (جیون لال، ص:۸۶۔۸۷)

۱۸۵۷ء کے غدر میں یہ تمام علم دوز شخصیتیں اس پر آشوب ماحول میں اپنی زندگی سے جدوجہد کررہی تھیں۔ مولوی صدرالدین آزردہ بھی اسی کہکشاں کے انجم ضیابار تھے:

آزردہ مر کے کوچۂ جاناں میں رہ گئے
دی تھی یہ دعا کس نے کہ جنت میں گھر ملے

مفتی صدرالدین آزردہ ۱۲ر دسمبر ۱۷۸۹ء میں دہلی کے ذی علم خاندان میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد مولانا لطف اللہ کشمیری سے حاصل کی اور علوم اسلامیہ، ریاضیات واقلیدس، معقولات ومنقولات وغیرہ کی تعلیم حضرت شاہ عبدالعزیز، حضرت شاہ محمد اسحٰق، حضرت شاہ عبدالقادر اور مولانا فضل امام خیرآبادی جیسے ہونہار اساتذہ سے حاصل کی۔ مکمل تعلیم حاصل کرنے کے بعد مفتی صاحب خود بھی بچوں کو معقولات و

منقولات کی تعلیم دینے لگے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے والد مولانا خیر الدین بھی مفتی صاحب کے شاگرد تھے۔ سرسید احمد خاں نے اپنی کتاب ''آثارالصنادید'' میں دہلی کے مشہور مدرسہ دار البقاء کا ذکر کیا ہے۔ جو جامع مسجد کے جنوبی دروازہ کی طرف ہے۔ اگلے زمانے میں اس میں طالب علم رہا کرتے تھے، لیکن اب یہ مدرسہ بالکل خراب و ویران ہو گیا تھا اور بالکل ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ مفتی صاحب نے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا کہ مدرسہ کو از سر نو تعمیر کروایا اور دوبارہ سے تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ ''آثارالصّنادید'' کے مطابق نہ صرف مدرسے کو از سر نو شروع کیا، بلکہ اس زمانے کے رواج کے برخلاف نئے انداز سے تعلیمی سلسلے کی شروعات کی جس میں نہ صرف طلبا کی تمام ضروریات کی کفالت کی جاتی بلکہ میوہ جات کھلائے جاتے اور جمعہ کی نماز کے بعد تفریح بھی نصاب میں شامل تھی۔

(بحوالہ: آثارالصنادید، مطبوعہ نول، کشور لکھنؤ ۱۸۷۶ء تیسرا باب ص:۱۱۔۱۲)

صدرالدین آزردہ کی شخصیت مختلف اوصاف کا مجموعہ ہے۔ ان کے زمانے میں کوئی شخص ایسا نہیں تھا جو ان کی خوش اخلاقی، ایمانداری، انصاف پسندی اور ان کے علمی و ادبی ذوق کی بلندی کا مداح نہ ہو۔ سرسید نے ''آثارالصّنادید'' میں صدرالدین آزردہ کا بہت خوش اسلوبی سے ذکر کیا ہے اور ان کے لیے کیا خوب شعر کہا ہے:

ہزار بار بشویم دہن زمشک و گلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

ترجمہ: (اس کا مطلب یہ ہے کہ ہزار بار بھی اپنے دہن کو مشک اور گلاب سے دھو کر آزردہ کا نام لینا بے ادبی ہے۔)

مزید لکھتے ہیں:

''قلم کو کیا طاقت کہ ان کے اوصاف حمیدہ سے ایک حرف لکھے اور زبان کو کیا یارا کہ ان کے محامد پسندیدہ سے ایک لفظ کہے.....''

آزردہ، غالب، مومن اور ذوق کے عہد کے ایک اہم شاعر ہیں۔ جن کے نام سے تو سب واقف ہیں، مگر کلام سے کم واقف ہیں جنھوں نے عربی، فارسی اور تینوں زبانوں میں خاصا کلام لکھا ہے، مگر بدقسمتی سے غدر کے وقت ان کا کلام ضائع ہو گیا۔ شاید یہی وجہ رہی ہو کہ انھیں وہ شہرت و مقبولیت نصیب نہیں ہوئی جس کے وہ حقدار تھے۔ حالانکہ ان کے ہم عصر شعرا نے ان کی شاعری کو خوب سراہا ہے۔ اس وقت کی کوئی ادبی و شعری مجلس آزردہ کے بغیر مکمل نہیں ہوتی تھی۔ مولوی عبدالحئی نے اپنے تذکرہ ''گلِ رعنا'' میں لکھا ہے کہ ''دلّی اس وقت آج کی ایسی دلی نہ تھی۔ بڑے بڑے کہنہ مشق شاعر..... جب ایک جگہ جمع ہوتے ہوں گے تو آسمان کو بھی زمین پر رشک آتا ہوگا۔'' (گلِ رعنا: ۲۲۷)

آزردہ کا کلام ہمیں باقاعدہ دیوان کی شکل میں تو نہیں ملتا، مگر اس زمانے کے شاعروں نے اپنے تذکروں یا خطوط میں آزردہ کا ذکر بڑے عزت و احترام سے کیا ہے۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ آزردہ کی شخصیت کوئی معمولی شخصیت نہیں تھی۔ لالہ سری رام اپنے تذکرہ ''خمخانۂ جاوید'' میں تحریر فرماتے ہیں:

''عربی، فارسی، ریختہ تینوں زبانوں پر قادر تھے۔ ہر ایک زبان میں نہایت فصاحت و بلاغت سے دادِ سخن دی ہے۔ جناب آزردہ مرحوم ان چند اشخاص میں سے تھے جنھوں نے اعلیٰ درجہ کی جامع قابلیت و فضیلت کے باوجود ملک سخن میں بھی اپنی اعلیٰ استعداد کا سکہ بٹھایا ہے۔ آپ اپنے زمانے کے مشاہیر میں سے تھے اور نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ منصب اعلیٰ پر ممتاز و حکام رس ہونے کے باوجود آپ کی طبیعت ظاہری نمائش سے کوسوں دور تھی..... نہایت منصف، خوش مزاج، نیک نفس، نفاست پسند تھے۔ چنانچہ آپ کی نفاست پسندی کی اکثر حکایتیں مشہور ہیں۔ ان اوصاف کے ماسوا زندہ دل، خلق مجسم کہنا مبالغہ نہیں۔''

(خمخانۂ جاوید، جلد اول، ص:۵۳)

آزردہ نے فارسی شاعری میں بڑے کمال و جوہر دکھائے ہیں۔ انہیں فارسی شاعری پر مہارت حاصل تھی۔ آزردہ کا مقابلہ فارسی کے بڑے بڑے شعرا سے کیا جا سکتا تھا۔ شیفتہ نے اپنے تذکرہ ''گلشنِ بے خار'' میں آزردہ کی فارسی شاعری کو ایرانی شعرا پر فضیلت بخشی ہے۔ لکھتے ہیں:

''خیاطِ ازل نے قابلیت کی قبا اس خوبی سے ان کی زیب تن کی ہے اور روشن گر قضا و قدر نے اس روشن دلی اور آگاہی سے ان کا ضمیر منور کیا ہے کہ ایسی فضیلت والا کوئی شاعر ایران سے نہیں ہوا۔''

(بحوالہ مفتی صدرالدین آزردہ حیات، شخصیت، علمی اور ادبی کارنامے، ص:۱۹۸)

آزردہ کے غالب سے بھی اچھے مراسم تھے بھلے ہی دونوں کے مزاج میں فرق تھا۔ غالب ٹھہرے آزاد رند مزاج اور آزردہ صوم و صلوٰۃ کے پابند اور متقی۔ اس کے باوجود بھی دونوں کی روز ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ غالب نے آزردہ کی شان میں ۱۴۱ اشعار پر مبنی ایک فارسی قصیدہ بھی لکھا ہے، لیکن اگر خطوط کی بات کی جائے تو صرف ''پنج آہنگ''

میں دو فارسی خطوط ان کے نام کے ملتے ہیں۔ غالبؔ اور آزردہؔ کے درمیان بے تکلفی تھی۔ آپس میں ہنسی مذاق بھی ہوتا تھا۔ حالیؔ نے یادگار غالبؔ میں ایک لطیفہ بیان کیا ہے وہ یہ کہ:

''ایک دن جبکہ رمضان کا مہینہ اور گرمی کا موسم تھا۔ مولانا آزردہؔ ٹھیک دوپہر کے وقت مرزا سے ملنے کو چلے آئے۔ اس وقت مرزا صاحب کوٹھری میں کسی دوست کے ساتھ چوسر یا شطرنج کھیل رہے تھے۔ مولانا بھی وہیں پہنچے اور مرزا کو رمضان کے مہینے میں چوسر کھیلتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگے کہ ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقید رہتا ہے، مگر آج اس حدیث کی صحت میں تردد پیدا ہو گیا۔

مرزا نے کہا: قبلہ! حدیث بالکل صحیح ہے، مگر آپ کو معلوم رہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقید رہتا ہے وہ یہی کوٹھری تو ہے۔''

(یادگار غالب، ص: ۶۸، غالب انسٹیٹیوٹ سے شائع شدہ)

۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی آمد دہلی والوں کے لیے تباہی و بربادی کا باعث بنی۔ ہر سو قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔ سرِ عام بے شمار لوگوں کو پیڑوں پر لٹکا کر پھانسیاں دی گئیں۔ ہزاروں بے گناہوں کو جیل پہنچا دیا گیا۔ ایسے دردناک ماحول سے دہلی کی زمین بھی کراہ رہی تھی۔ اس دور کے شاعر و ادیب بھی مصیبت سے دوچار ہو رہے تھے۔ مفتی آزردہؔ کے قریبی رشتہ دار اور دوست و اقارب بھی اس جبر و تشدد کا شکار ہوئے۔ مصطفیٰ خاں شیفتہؔ کو سات سال کی قید ہوئی تو امام بخش صہبائی اور ان کے خاندان کے اکیس افراد انگریزوں کی گولیوں کا شکار ہوئے۔ آزردہؔ کو ان کے شہید ہونے کا بے حد صدمہ پہنچا اور بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا:

کیونکر آزردہؔ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

شیفتہؔ کے لیے آزردہؔ نے یہ اشعار کہے ہیں:

ٹکڑے ہوتا ہے جگر جان پہ بن آتی ہے
مصطفیٰ خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے
رہے ہم نہ کچھ مصطفیٰ خاں کے غم میں
نہ فکرِ سخن، نے پڑھانے کے قابل

غالبؔ نے بھی جنگ آزادی کے دردانگیز ماحول کو اپنے خطوط میں پیش کیا ہے، اور دستنبو جیسی کتاب بھی انہی حالات سے متاثر ہو کر لکھی۔ میر مہدی مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اومیاں، سید زادے، آزادہ، دلّی کے عاشق دلدادہ، ڈھئے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے حسد سے لکھنؤ کو برا کہنے والے نہ دل میں مہر و آزرم، نہ آنکھوں میں حیا و شرم، نظام الدین ممنونؔ کہاں، ذوقؔ کہاں، مومنؔ کہاں، ایک آزردہ سو خاموش، دوسرا غالبؔ وہ خود بخود مدہوش نہ سخنوری رہی نہ سخندانی کس برتے پر تتا پانی۔ ہائے دلّی، والے دلّی۔ بھاڑ میں جائے دلّی۔''

(عودِ ہندی، ص: ۱۰۸)

آزردہؔ سے متعلق ایک واقعہ یہ ہے کہ سپاہیوں نے حکیم احسن اللہ خاں (مومن خاں مومنؔ کے First Cousin تھے) کا مال لوٹ لیا تو بہادر شاہ ظفر نے مولوی صدرالدین خاں سے کہا کہ جب تک حکیم احسن اللہ خاں کا مال واپس نہ کیا جائے گا اس وقت تک تمہیں دربار میں شریک ہونے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

(روزنامچہ، منشی جیون لال۔ ص: ۲۱۲)

چنانچہ مولوی صاحب کے فوجی افسران سے اچھے تعلقات تھے۔ اس لیے مفتی صاحب بادشاہ کے اس حکم میں کامیاب ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے اس ہنگامے میں فتح پوری مسجد اور جامع مسجد انگریزی فوج کے حملے کا شکار ہوئیں۔ فتح پوری مسجد کو انگریزوں نے چھنّا مل کے ہاتھوں بیچ دیا تھا۔ فوجیوں نے جامع مسجد میں گھس کر مسلمان لوگوں کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچائیں اور اپنے قبضے میں لے لیا۔ اذان و نماز پر بھی پابندی عائد کر دی۔ اب وہاں نہ نمازیوں کی بھیڑ رہی نہ اذان کی گونج۔ مرزا قربان علی بیگ سالکؔ نے اپنی نظم جہان آباد کے ایک بند میں لکھا ہے:

ہجوم مسجد کا کیا کروں اظہار
صف ملائکہ ہوتی جہاں نماز گزار
ہر ایک صف میں نہ رہتا نہ مصلیوں کا شمار
اب اس کو دور ہی سے دیکھنا ہوا دشوار
نماز ہے نہ اذاں ہے نہ کوئی جاتا ہے
جب اس کو دیکھئے خالی تو جی بھر آتا ہے

انگریزوں نے پانچ سال تک اس مسجد کو ویران رکھا۔ اس معاملے کو فتح بخشنے والے مفتی صدرالدین آزردہؔ ہی ہیں جنھوں نے اپنی محنت و سعی سے اس مسجد کو دوبارہ رونق بخشی۔

دہلی کے منتشر حالات میں آزردہؔ کو فتویٰ جہاد کے الزام میں جیل بھی جانا پڑا۔ میرے خیال میں دہلی کے کسی شخص نے بھی یہ خیال نہیں کیا ہوگا کہ مفتی صدرالصّدور کو جیل کی صعوبتیں بھی اُٹھانی پڑیں گی:

ہمیں قید کرنے سے کیا نفع صیّاد
نہ تھے دام میں ہم تو لانے کے قابل

آزردہ کے جیل جانے کا ذکر غالب نے حکیم سید احمد حسن مودودی کے ایک خط میں لکھا ہے:

''مولوی صدرالدین صاحب بہت دن حوالات میں رہے۔ کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا۔ روبکاریاں ہوئیں۔ آخر صاحبانِ کورٹ نے جاں بخشی کا حکم دیا۔ نوکری موقوف، جائیداد ضبط، ناچار خستہ وتباہ حال لاہور گئے۔''

(اُردوئے معلیٰ، ص:۲۴۱)

اس تباہی کے عالم میں آزردہ کو ایک بڑا زیاں یہ اُٹھانا پڑا کہ ان کی کتابوں کا بیش قیمت سرمایہ برباد ہوگیا جس میں دوسری کتابوں کے علاوہ ان کی تخلیق کردہ کتابیں بھی موجود تھیں۔ اگر یہ حادثہ نہیں ہوا ہوتا تو آج ہم غالب ومومن کی طرح آزردہ کے کلام سے بھی لطف اندوز ہوتے:

خدایا یہ رنج اور یہ ناصبوری
نہ تھے ہم تو اس آزمانے کے قابل

آزردہ نے دہلی کے دردانگیز واقعات کی تصویر شہر آشوب میں کھینچی ہے جسے پڑھ کر بخوبی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس وقت کے پرآشوب حالات نے کس طرح آزردہ پر گہرے اثرات مرتب کئے تھے۔ شہر آشوب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

آفت اس شہر میں قلعہ کی بدولت آئی
واں کے اعمال سے دہلی کی بھی شامت آئی
روزِ موعود سے پہلے ہی قیامت آئی
کالی میرٹھ سے یہ کیا آئی کہ آفت آئی
گوش زد تھا جو فسانوں سے وہ آنکھوں دیکھا
جو سنا کرتے تھے کانوں سے وہ آنکھوں دیکھا

عیش وعشرت کے سوا کچھ بھی نہ تھا جن کو یاد
لٹ گئے کچھ نہ رہا ہوگئے بالکل برباد
ٹکڑے ہوتا ہے جگر سن کے یہ ان کی فریاد
پھر بھی دیکھیں گے کبھی دہلی آباد
کب تلک داغ ایک ایک کو دکھلائیں ہم
کاش ہو جائے زمیں شق تو سما جائیں ہم

ان سب مصائب وآلام سے گزرنے کے بعد آزردہ کی عمر کے آخری دوسال فالج کے مرض میں گزرے اور یہی مرض ۱۶/ جولائی ۱۸۶۸ء جمعرات کے دن ان کی وفات کا باعث بن گیا۔

وہ آزردہ جوخوش بیاں تھے نہیں اب
اشارے سے بھی کچھ بتانے کے قابل

مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ آزردہ نہ صرف تین زبانوں پر مہارت رکھنے والے اچھے شاعر ہیں بلکہ مخلص دوست، دانش منداُستاد، نیک نفس مفتی اور انصاف پسند صدرالصدور ثابت ہوئے۔

آزردہ کی ایمانداری، دیانت داری، عقل مندی، ان کی سوجھ بوجھ اوران کی ذمہ دارانہ حیثیت کے ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز ممبران بھی قائل تھے۔ اس لیے انگریزی حکومت نے مفتی صاحب کو ۱۸۲۰ء کے قریب صدرالصدور اور مفتی کے عہدہ سے نوازا۔ یہ عہدہ تنخواہ اور منصب کے لحاظ سے اس دور کے جج کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ آزردہ نے اس عہدہ کو ۳۰ سال تک بخوبی نبھایا۔

نواب شیفتہ نے اپنے تذکرے ''گلشن بے خار'' میں لکھا ہے کہ:

''جھگڑوں کے فیصلہ کرنے پر مامور ہیں۔ جو منصب اعلیٰ ہے۔ جس کو اہلِ فرنگ کی اصطلاح میں صدرالصّدور کہتے ہیں فی زمانہ ان کی سلطنت میں اہل ہند کے لائق اس سے بڑا کوئی عہدہ نہیں ہے۔ مولانا نے اس دنیوی کسب معاش کے ذریعے کو دینی ثواب حاصل کرنے کا وسیلہ بنا رکھا ہے کیونکہ ان کی تمام تر کوشش مخلوق کی حاجت روائی میں صرف ہوتی ہے۔ ان کے انصاف کی برکت ہر خاص وعام پر محیط ہے۔''

(مفتی صدرالدین آزردہ، حیات، شخصیت، علمی اورادبی کارنامے، ص:۲۲)

مولوی کریم الدین لکھتے ہیں:

''یہ عہدہ اس شخص کے واسطے زیبا تھا اور واقع میں ہر مقدمہ کی وہ ایسی تحقیق کرتے ہیں کہ یقیناً کوئی فیصلہ ان کا خالی حق سے نہیں ہوتا۔ حق دار کو حق پہنچاتے ہیں۔ اس لیے اب میں یہ کہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ تا قیامت اس شخص کو اس عہدہ پر قائم رکھے تا کہ ظلم جہاں سے یک قلم موقوف ہو۔'' (ایضاً، ص:۲۲)

مختصراً یہ کہ برطانوی سامراج کو اور برطانوی مکروہات کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ وہ جس نابغۂ روزگار سے اپنا مفاد حاصل کرتے ہیں ضرورت ختم ہوجانے پر سفّا کی سے قتل بھی کردیتے ہیں۔ صہبائی کو دلّی کالج میں ملازمت انگریزوں نے ہی دی تھی، ان کے سینے پر گولی بھی انھوں نے ہی داغی۔ آزردہ کو صدرالصّدور کا عہدہ بھی انھوں نے ہی دیا تھا۔ گرفتار بھی برٹش گورنمنٹ نے ہی کیا۔ ایسے معاملات مزید تلاش کیے جاسکتے ہیں۔

○○